"اے نشۂ ظہور" میں اسلوبیاتی تناظرات کی بازیافت

The Style of Travelogue “Nasha E Zahor”

ڈاکٹر منزہ مبین* ؍ ڈاکٹر نقیب احمد جانؔ**

Abstract:

Dr. Salman Ali is Professor and Chairman of Department of Urdu, University of Peshawar. He is not only a researcher but also a creative writer. “Ay Nasha e Zahoor” is a book written by him in Urdu literary genre, Reportage. This book is a travelogue of the writer along-with his teachers and other research fellows to the Sardarpur Jhander Library, Melsi. This was a study tour, which covers distances among, Dara Adam Khel, Kohat, Kalabagh, Mianwali, Multan, Melsi, Bhawalpur, Muzaffargarh, Dera Ghazi Khan, Dera Ismail khan and through Kohat back to Peshawar. On the other hand, this short book encompasses a verity of writing styles and expressive, which keep the reader tightly involved up to its end. This article deal with critical appreciation of the said book.

Key Words: Dr. Salman Ali, Reportage, Ay Nasha e Zahoor, Jhander Library, Peshawar, Procedure

کلیدی الفاظ: ڈاکٹر سلمان علی، رپورتاژ، اے نشۂ ظہور، جھنڈیر لائبریری، پشاور، اسلوب

اگر کسی ادیب کا صرف ایک ہی فن پارہ آپ کے ہاتھ لگے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مزید کچھ لکھ نہیں سکتا۔ مزید لکھنا یا نہ لکھنا ایک الگ بحث ہے۔ اس کی بہت ساری وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ہاں قاری کو چاہیے کہ اس ایک

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ویمن یونیورسٹی صوابی

** ایسوسی ایٹ پروفیسر، صدر شعبہ اردو، ویمن یونیورسٹی صوابی

فن پارے کو پڑھے، غور سے پڑھے اور دیکھے کہ اس فن پارے کے اندر کیا کچھ موجود ہے اور اس فن پارے سے ادیب کی ذات اور اس کی قوتِ تحریر کی کس حد تک غمازی ہو سکتی ہے۔ ایک مختصر سی کتاب "مضامینِ پطرس" اگر پطرس بخاری کے لیے اُردو ادب کے میدان میں شہرتِ عام اور بقائے دوام کا سبب بن سکتی ہے تو کسی اور ادیب کے لیے بھی یہ امکان بعید از قیاس نہیں ہے۔ اگر پشتو کے ہر دل عزیز اور معروف ترین شاعر "رحمان بابا" کی کم و بیش تین سو غزلیات پر مشتمل دیوان ان کو بلا مقابلہ اور بلا اختلاف پشتو غزل کا معروف ترین اور ہر دل عزیز شاعر بنانے کے لیے کافی ہے تو کوئی اور بھی اسی معیار کی شاعری کر کے یہ مقام حاصل کرنے کا اپنا حق محفوظ رکھتا ہے۔ "اے نشۂ ظہور" پروفیسر ڈاکٹر سلمان علی کی ۱۰۲ صفحات پر مشتمل مختصر سی کتاب ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب کے غائر مطالعہ سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں انہوں نے اُردو رپورتاژ کی روایت کو کس طرح برقرار رکھا ہے اور اس میں ان کے اندازِ تحریر، اسلوب اور کتاب کی بُنت کے حوالے سے ان کی مشاقی کا مشاہدہ قاری ہر صفحے پر بہ آسانی کر سکتا ہے۔

اصناف ادب میں رپورتاژ صحافت میں رپورٹ کا مترادف لفظ ہے۔ یہ لفظ فرانسیسی لفظ Reportage سے معرب ہو کر اردو میں مستعمل ہے، اس نیم صحافتی اور نیم ادبی صنف کے لیے جس میں رپورتاژ نگار کسی واقعے، کسی سفر کا حال خالص اور سپاٹ صحافتی انداز میں نہیں بلکہ ادبی چاشنی اور مٹھاس کی ملاوٹ کے ساتھ بیان کرتا ہے، اس طرح وہ اس میں اپنے تخیل، اپنے وجدان اور اپنے ذوقِ نظر کی ناپیدا کناریوں کو سمیٹ کر اس رپورٹ کو ادبی صنف کا درجہ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اردو ادب میں اگرچہ رپورتاژ نگاری کی تاریخ اتنی طویل نہیں ہے اور یہ اردو ادب میں ابھی "تازہ واردان" میں ہی ہے لیکن اردو کی دوسری اصناف کی طرح رپورتاژ بھی اپنی اہمیت و افادیت کا لوہا بہت جلدی منوا چکا ہے۔ اور ابتدا سے لے کر اب تک اردو رپورتاژ نے فنی بلندیوں کا طویل سفر طے کیا ہے۔ اردو رپورتاژ نگاروں کی جودتِ طبع نے اس صنف کی قبولیت اور شہرت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس طرح ہیئتی و اسلوبی تناظر کے علاوہ موضوعاتی بوقلمونیوں کے تناظر میں بھی یہ صنف اپنے وسعتِ داماں کے کرشمے دکھا چکا ہے اور اتنی اہمیت حاصل کر چکی ہے کہ اس سے اب کسی طور سے بھی چشم پوشی ممکن نہیں ہے۔ موضوعاتی سطح پر اگر دیکھا جائے تو ابتدا میں یہ صنف صحافتی دائرے کے اندر ہی محصور تھی لیکن ادیبوں اور فنکاروں کی فنی جولانیوں نے اس کو آخر کار ادبی زمرے میں لا شمار کیا۔ بے شک رپورتاژ میں واقعات نگاری ہوتی ہے لیکن یہ واقعات نگاری بغیر کسی کمی بیشی اور خارجی عوامل کے محض واقعات نگاری نہیں ہے بلکہ اس میں رپورتاژ نگار کے تخیل، وجدان اور محسوسات کا عمل دخل جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اس میں رپورتاژ نگار کی شخصیت، اس کے احساسات اور جذبات کا عکس کبھی واقعات کے پس منظر

اور کبھی پیش منظر میں ابھرتا اور ڈوبتا رہتا ہے۔ہاں یہ ہے کہ رپورتاژ میں خارجی حقائق کا بیان حال کے زمانے میں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں ماضی و مستقبل کا عمل دخل رپورتاژ نگار کے خیالات و تخیلات کے عکس کے طور پر ظاہر ہوتا رہتا ہے۔اور یہی عکس ہے کہ جو اس کو سپاٹ صحافتی رپورٹ سے الگ ایک ادبی صنف کا درجہ دیتا ہے۔یہاں خارج کے بیانیے میں داخل کو سمو دینے کی صلاحیت کارفرما نظر آتی ہے اور داخلیت کی یہ کارفرمائی اچھے رپورتاژ کے لیے لازمی ہے کیونکہ محض خارجیت کا تاثر اور بیانیہ اچھے رپورتاژ کے لیے کافی نہیں جبکہ تک کہ مصنف باطنی جذبات وتاثرات کی گھلاوٹ سے تحریر میں ادبی چاشنی اور مٹھاس کے ساتھ ساتھ خارجی واقعات نگاری کو شیر وشکر کر کے پیکرِ رپورتاژ کی رگ رگ میں بھر نہیں دیا جاتا۔جنگ، قحط، ادبی و تہذیبی جلسے، تقریبات جو کہ رپورتاژ کے ابتدائی موضوعات تھے اور پھر دورِ جدید میں بالخصوص سیر وسیاحت کے تناظر میں رپورتاژ کی افادیت واہمیت کو واضح کرنے کے لیے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے قابل توجہ ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''دوران سفر کا بیان دراصل سفر نامے سے مخصوص ہوتا ہے لیکن موجودہ دور کے ادیبوں نے اس جدید سفر نامے میں ادبیت، افسانویت، گہرے جذبات اور تاثرات، مسائل پر صحت مندانہ نقطہ نظر اور افادی گرفت اور موضوع میں وحدت داخل کر کے اسے رپورتاژ کا ہی درجہ دے دیا ہے۔''(1)

سلمان علی کے رپورتاژ ''اے نشہ ظہور'' کو اگر مندرجہ بالا اقتباس کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی اس کتاب کو بجا طور پر رپورتاژ کہا جا سکتا ہے۔اس میں سفر کے حالات ہیں لیکن سفر نامے کے انداز میں نہیں، اس میں مسافتوں کا بیان ہے لیکن سپاٹ واقعات نگاری نہیں ہے۔انہوں نے اپنی اس کتاب میں اپنے سلجھے ہوئے تخیل کی کارفرمائی سے وہ سماں باندھا ہے جس نے پوری کتاب پر رپورتاژ کی چھتری تان دی ہے۔اس میں انہوں نے اس زورِ بیان کا مظاہرہ کیا ہے جس کے طفیل ہزاروں اور سیکڑوں سالوں سے زبان و بیان کے ماہرین مثلاً حکیم لقمان، ابن خلدون، سعدی شیرازی، مولانا روم، عمر خیام، امیر خسرو، چیخوف، ٹالسٹائی، فلابیر، موپساں، گوئٹے، میر امن، نذیر احمد، خوشحال خٹک، رحمان بابا، پطرس بخاری، مشتاق احمد یوسفی اور مختار مسعود جیسے سینکڑوں ناموں کو شہرتِ عام اور بقائے دوام کی سند عطا کی ہے۔کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن فنی اور اسلوبیاتی سطح پر مروج و معاصر فنی تقاضوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔فن کی میزان پر پورا اترتا ہے۔کسی بھی فن پارے کو طویل زندگی اس کی فنی تکمیل ہی عطا کرتی ہے اور پھر ادب میں فنی تکمیل کا اہم زینہ حسن بیان ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری ادبی فنکاری کے اس زینے کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''کامیاب ہونے والوں کی کامیابی میں سب سے بڑا حصہ حسن بیان نے لیا ہے۔پریم چند، سجاد حیدر

یلدرم، نیاز فتح پوری، علی عباس حسینی، مجنوں گورکھ پوری، عصمت چغتائی، منٹو، ہمارے قریب کے زمانے میں انتظار حسین، اشفاق احمد، جیلانی بانو۔۔۔ حسن بیان کی اہمیت کو زیادہ محسوس کیا ہے۔اس لئے دلوں میں ہمیشہ قائم رہنے والی جگہ بنائی ہے یا اس کے قرینے پیدا کئے ہیں۔"(2)

خالقِ کائنات نے انسان کو بات کرنے کا ڈھنگ عطا کیا۔اسے زبان کے ذریعے اپنا مافی الضمیر دوسروں تک پہنچانے کا ملکہ ودیعت کیا اور اس حقیقت کو قرآنِ عظیم الشان میں ان الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا کہ

"الرحمٰن o علم القرآن o خلق الانسان o علمه البیان"(3)

ترجمہ:(رحمان(وہی ہے)، جس نے قرآن کا علم دیا، انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان کرنا(بولنا) سکھایا۔)

ان آیات کی رو سے خالق کائنات نے انسان کو بیان کا ملکہ عطا کیا ہے اور بیان کا یہ ملکہ جس انسان میں اپنی اعلیٰ ترین سطح پر جلوہ گر ہو وہ بطورِ انسان اعلیٰ درجے پر فائز ہوتا ہے۔ اور یہ حق رکھتا ہے کہ انسانی معاشرہ اس کو تادیر یاد رکھے اور اس کی اعلیٰ صفات کا معترف ہو۔ پھر زبان و بیان کی اس قدرت اور ودیعت کا ایک پہلو تخلیقی پہلو ہے۔ادیب الفاظ کی مدد سے ان گنت جملے تخلیق کرنے پر قادر ہوتا ہے۔زبان اس کے لیے الفاظ کا گودام ہوتی ہے۔صرف گودام ہی نہیں بلکہ لسانی اصولوں اور قاعدوں کی طاقوں سے سجا ہوا گودام، جس میں سے ہر ادیب اور شاعر اپنی بساط و استطاعت کے مطابق مختلف طاقوں سے الفاظ چن چن کر اپنے فن پارے کی تزئین و آرائش کے لیے سامان بہم پہنچاتا ہے۔اس عمل میں کامیابی یا ناکامی کا انحصار ادیب کی زیرکی، فنی استطاعت اور حسنِ انتخاب کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ کوئی ادیب اس کام میں جتنی صفائی اور چابکدستی کا مظاہرہ کرے گا اس کے فن پارے کی اہمیت و افادیت اسی تناسب سے گھٹتی یا بڑھتی جائے گی۔ "اے نشۂ ظہور" کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا زبان کے اس گودام کے تمام طاقوں سے واقف ہے اور اس کو معلوم ہے کہ اپنے فن پارے کے کس صفحے، کس پیرا گراف یا کس سطر کے لیے کون سی طاق سے کس وزن کے الفاظ کا چناؤ کرنا لازمی ہے اور ان الفاظ کو نگینوں کی طرح کس طرح اپنے جملوں میں جڑنا ہے۔اسی فنی مہارت کے مظہر اس کتاب میں اسلوب کی روانی اور چابکدستی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں الفاظ کی ریزہ کاری ایسے انداز میں کی گئی ہے کہ جو لفظ جہاں استعمال ہوا ہے ایسا لگتا ہے جیسے اسی موقع و محل کے لیے تراشا گیا ہے یا کسی دور افتادہ طاقچے سے اٹھا کر لایا گیا ہے۔اسی طرزِ تحریر کا کرشمہ ہے کہ فن پارے کی زبان و بیان میں گھیرائی، گہرائی اور جامعیت کے نقوش جلوہ گر نظر آتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے پرکار اور مشاقی سے تراشے ہوئے جملے مقولوں کی سی شکل اختیار کر گئے ہیں جو وسیع مشاہدے کی ترجمانی کرتے ہیں اور بیان میں تلمیحاتی اسلوب دقتِ نظر اور وسیع مطالعے کی غمازی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً اعتراف کے

عنوان سے جذبات کے اظہار کے لیے جن الفاظ و تلمیحات کا انتخاب کیا وہ ایسا سماں باندھ دیتے ہیں کہ وجدانی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ یہ سفر میرے لیے ایسا خضر ثابت ہوا کہ کائنات کے ازلی بھید ''کشتی مسکین''، و''جان پاک''، و''دیوار یتیم'' کے عقدے مجھ پر وا کئے البتہ ''سیر و فی الارض'' کی بحر بے پایاں حکمت کا ایسا راز کھلا جس سے از سر نو انفس و آفاق کی حقیقت جاننے کا موقع نصیب ہوا۔''(4)

ڈاکٹر سلمان علی بعض دفعہ استخراج نتائج کے عمل میں منہمک ہو کر ایسی نیم منطقی اور گہری باتیں کہہ جاتے ہیں کہ قاری یک لخت حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے جملے جن میں تفکر کی پرتیں اور وسعتوں کے ڈانڈے سمٹے ہوئے نظر آتے ہیں اور قاری کو دعوت فکر دیتے دکھائی نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

> ''لمحوں کی حفاظت کے اس عمل میں اپنی بقا نظر آئی۔''(5)
>
> ''سمت کا تعین صدیاں اور تبدیلی لمحے۔۔۔''(6)
>
> ''شناخت تبدیل، وجود معدوم۔''(7)

اور پھر یہ فقرے اور جملے کسی دقیق فلسفیانہ مضمون کے سطور میں نہیں بلکہ ہلکے پھلکے انداز میں آگے بڑھتے ہوئے رپورتاژ کے بیچوں بیچ سے ایسے سر ابھارتے ہیں کہ قاری ٹھٹک جاتا ہے اور ان جیسے جملوں کو بار بار پڑھ کر ان کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے۔ اور آخر کار جب اس کے معنی تک پہنچتا ہے تو یک گونہ سرخوشی و سرشاری اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلمان کے اسلوب کی اس خصوصیت نے ان کے ادب پارے میں وہ خوبی پیدا کر دی ہے کہ قاری اس کو ایک دفعہ پڑھنا شروع کرے تو اس کو بیچ میں چھوڑ کر کسی دوسرے وقت پر اٹھا کر نہیں رکھ سکتا بلکہ ایک ہپناٹائز معمول کی طرح خود بخود پڑھتا جاتا ہے اور کتاب کی وسعتوں میں معدوم ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ کتاب کا اختتام ہو جاتا ہے اور قاری کو تشنگی محسوس ہوتی ہے کہ اس سہانے خواب سے اتنی جلدی جاگنا نہیں چاہیے تھا۔ اسلوب مصنف کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جو الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسلوب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف کی شخصیت نمایاں رہتی ہے۔ یہ مصنف کے ذہنی اور جذباتی تجربے کا ظاہری عکس و روپ ہوتا ہے۔ ادیب کے تجربات الفاظ کی شکل میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ بہترین اسلوب کے لیے ارفع تخیل کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر مکمل قدرت درکار ہوتی ہے۔ زبان کے الفاظ و محاورات کو اپنی جودتِ طبع اور ترفعِ تخیل کے محلول میں ڈبو کر اپنے جداگانہ مخصوص انداز میں پیش کرنے کا نام اسلوب ہے۔ اسلوب سے متعلق سید عبداللہ کی رائے کچھ یوں ہے کہ

''اسلوب بیان کے دو پہلو ہیں ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔ داخلی خیال سے اور خارجی زبان سے متعلق ہے۔ شعر و نثر میں ایک فرق ہے کہ شاعر تخلیق کے دوران اپنے مواد کو خود تخلیق کرتا ہے لیکن نثر کا مواد پہلے سے ہی موجود ہوتا ہے۔ جسے وہ منصوبے کے تحت تعمیر کرتا ہے۔''(8)

اس بیان کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو شاعر کی نسبت نثر نگار کے لیے مواقع کم ہی ہوتے ہیں کیونکہ وہ پہلے سے موجود مواد کو اپنے زورِ بیان اور طرزِ نگارش کے ذریعے سے متشکل کرتا ہے جہاں اس کو شاعر کے برعکس مکمل آزادی میسر نہیں ہوتی۔ شاعر اپنے الفاظ اور شعر کی رعایت سے اپنے مواد میں حذف و اضافے کی سہولت سے بہرہ مند ہو سکتا ہے اس کے برعکس نثر نگار کو یہ مواقع شاذ ہی ہاتھ آتے ہیں۔ پھر رپورتاژ میں یہ کام کچھ مزید مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں پر پہلے سے موجود مواد کو بنیاد بنا کر رپورتاژ نگار آگے بڑھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کو اس میں اپنے تخیل کی رنگ آمیزی بھی کرنی ہوتی ہے۔ ایک طرف حقیقتوں کا بیان اور دوسری طرف اس میں تخیل کی آمیزش سے رپورتاژ نگار کو نہایت چابک دستی اور مہارت کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے گہرے اور وسیع مشاہدے کے ساتھ ساتھ الفاظ کا چناؤ اور جملوں کی بنت پر توجہ دینا نہایت اہم عمل ہے ورنہ رپورتاژ کو رپورتاژ کے فنی معیار پر رکھنا ممکن نہیں ہو سکے گا۔ یہ جُوئے شیر لانے کے لیے ہر ادیب اپنا مخصوص اسلوب متعارف کرتا ہے۔ سو ڈاکٹر سلمان نے بھی وہی کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریر میں بے جا لفاظی سے کام نہیں لیا تاہم وہ سلاست کے پیچھے بھی ہاتھ دھو کر نہیں پڑے۔ وہ لفاظی نہیں کرتے لیکن جہاں ضرورت پڑی وہاں الفاظ کا چناؤ بڑی مہارت اور سلیقے سے کیا ہے۔ اس طرح ان کی تخلیق ''اے نشہ ظہور'' میں ہندی، فارسی، پنجابی، انگریزی کے الفاظ، مثلاً ہمراہی و ہم رکابی، جزادہی، گیان دھیان، تہی دست، سواگت، زمام کار، مستقر، کوتاہ بینی، لیت و لعل ,Easy، Develop، Centrifugal, Centripetal، Script غمزہ و عشوہ، سہ بعدی، شبستان، شنوائی، آواگون، علیک سلیک، وغیرہ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ انہوں نے صنائع و بدائع کے استعمال کے ذریعے عبارت میں شاعرانہ لطافت، ندرت اور تازگی پیدا کی ہے۔ عابد علی عابد کے بقول:

''اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کا وہ انفرادی طرز نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے متمیز ہو جاتا ہے۔''(9)

اس طرح ڈاکٹر سلمان کا اسلوب انہیں صاحبِ طرز ادیبوں کی صف میں شامل کر جاتا ہے۔ ان کا ذہن مناسبتوں اور مشابہتوں کے ذریعے منظر کو وسیع سے وسیع تر کر دیتا ہے۔ انہوں نے مخصوص موقعوں پر مرکبات، تلمیحات، استعارات و کنایات اور محاورات کا استعمال بہ کثرت اور بے ساختہ انداز میں کیا ہے جیسے کہ؛ مجسم

تبسم، شریر پھندا، بوجہ نقص امن، ابوالکلامی خصائص، غلطاں و پیچاں، شوریدہ بختی، ہر کہہ و مہہ، ترنگ و امنگ، دیو ہیکل، آلتی پالتی مارے وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔انہوں نے تخلیق کے معنی اور اس معنی کی پیچیدگی پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کر کے مواد کے تقدس کا احساس دلایا ہے جو ادب پارے میں مضمر معنی کو اساسی حیثیت فراہم کرتا ہے۔یہ کیفیت قاری کو فوراً اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔مذکورہ بالا بیانیے کی وضاحت اسلوبیاتی تنقیدات کی روشنی میں کچھ اس طرح سے ہو سکتی ہے کہ

''لفظ سے معنی پھوٹنے والی معانی کی فراوانی کا احساس دلانے، ابہام کو ایک قدر کے طور پر پیش کرنے اور مصنف کے بجائے تصنیف کو مرکز نگاہ بنانے پر مصر تھی۔''(10)

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین ڈاکٹر سلمان کے اسلوبی سطح پر روایات کی پاسداری کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں :

''سلمان علی فکری و جذباتی نہج پر اچھا خاصا باغی ہے لیکن اسلوب کے ضمن میں اس نے روایات کی پوری پاسداری کی ہے۔''(11)

تنقیدی تناظر میں دیکھا جائے تو در حقیقت موصوف تخلیق کار لفظ سے اس کے رائج معنی کو قطعاً الگ نہیں کرتا بلکہ لفظ کو اس طور سے استعمال کرتا ہے کہ وہ متعدد معانی کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق:

''تخلیق دراصل تین سطحوں سے ہو کر گزرتی ہے۔وہ اپنے مصنف کی ذات کا اظہار بھی ہوتی ہے۔اس کے عصری شعور کی آواز بھی اور اس دور سے پیدا ہونے والی آفاقی اقدار کی گونج بھی۔۔۔۔''(12)

بہترین اور عمدہ اسلوب وہ ہوتا ہے جس کا خالق اپنے مضمون کی معنویت میں اتنا محو اور سرشار ہو کہ اسے گمان بھی نہیں گزرتا کہ وہ کسی نئے اسلوب کی تخلیق کر رہا ہے۔ڈاکٹر سلمان کا اسلوب اسی انداز کی غمازی کرتا ہے۔ان کا طرزِ تحریر مکمل طور پر فطری دکھائی دیتا ہے۔''اے نشہ ظہور''میں اسلوب کی رنگا رنگی شخصیات کے تعارف میں ان کی شخصیتوں کے عکس کے طور پر ہر جگہ ایک نئی شان و شوکت اور نئے انداز سے جلوہ گر ہوتی نظر آتی ہے۔انہوں نے جہاں کہیں شخصیات کے تعارف و تعریف کے لیے قلم اٹھایا ہے۔وہاں اسلوب کی چکاچوند سے تحریر کے پیراہن میں جگنو بھر دیے ہیں۔"اے نشۂ ظہور" میں مختلف شخصیات، جو شاملِ سفر تھے، کے حوالے سے فرداً فرداً لکھنے کے علاوہ انہوں نے ان دوستوں کو بھی بھلایا نہیں جو کسی سبب سے ان کے ساتھ اس سفر میں موجود نہیں تھے۔انہوں نے ہمرہانِ جادہ کے ساتھ ان کے ذکر اور اپنے پروازِ تخیل سے ان کو بھی شاملِ سفر کر کے شاملِ کتاب کر دیا ہے، کہتے ہیں:

''موجود تو اور بھی دوست تھے مگر وہ اس سفر میں ہمارے ساتھ شامل نہیں تھے۔۔۔وہ جن کی اچھائیوں اور برائیوں کے ذکر سے ہم نے اپنی سفری محافل کی بیٹھکیں سجائیں اور ایسا لگا کہ وہ ہمارے سنگ ہیں۔''(13)

(

انسانی زندگی کی مصروفیات اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ عام روز مرہ زندگی میں کسی شخصیت سے ملاقات کے لیے وقت نکالنا یا شخصیت کا ملاقات کے لیے وقت دینا قدرے مشکل ہو گیا ہے۔علاوہ ازیں ایک دو ملاقاتوں میں شخصیت کے ظاہر و باطن کے پردے چاک ہونا ناممکن ہے۔وہ عظیم ہستیاں جو ماضی کا حصہ بن گئیں ہیں لہذا اب ان سے ملنے کی آرزو اور ان کو اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھ لینے کی تمنا ہمیشہ کے لیے تشنہ ہی رہتی اگر ان کو جیتے جاگتے انسان کی صورت میں متشکل کرنے کا اہم فرض خاکہ نگاری کے ہاتھوں انجام نہ پاتا۔خاکہ نگار جب تک شخصیت کے سماجی روابط، عادات و اطوار، معاشی اور معاشرتی حالات و نظریات سے مکمل طور پر آگاہ نہ ہو اس وقت تک بہترین خاکہ تحریر نہیں کر سکتا۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اکثر خاکے محض تعارفی، تاثراتی اور سوانحی تحریر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔خاکہ نگار کارٹونسٹ نہیں ہوتا جو محض استہزائیہ انداز میں اپنے ممدوح کے خدوخال اجاگر کرتا ہے بلکہ خاکہ نگار اپنے ممدوح کی پنسل اسکیچ اس طرح بناتا ہے جس میں ممدوح اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ لکیروں کی صورت میں قاری کے ذہن پر جلوہ گر ہوتا ہے۔پروفیسر غلام جیلانی اصغر کے بقول:

''سنجیدہ خاکہ نگار کسی پسندیدہ شخصیت کا جب خاکہ لکھتا ہے تو اس کا مقصد اس کا مذاق اڑانا نہیں ہوتا بلکہ اس کی خوبیوں کو ایک مختلف زاویہ سے اجاگر کرنا ہوتا ہے وہ اپنے ممدوح کی کمزوریوں کو بشری کمزوریاں یا مجبوریاں سمجھ کر نظرانداز کر دیتا ہے۔''(14)

''اے نشہ ظہور''میں جس مختصر لیکن خوبصورت اور عمدہ طریقے سے ڈاکٹر سلمان علی نے خاکہ نگاری کے فن سے اپنی واقفیت کا ثبوت دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مشتاق احمد یوسفی ان کو Thumbnail Sketches کہتا ہے۔دوران سفر مختلف شخصیات کی فکر و آگہی، حرکات و سکنات اور نشست و برخاست کے غائر مشاہدے سے موصوف کو ان کے بارے میں جس طور سے واقفیت ہوئی اسے بغیر کسی کم و کاست کے نہایت دیانتداری اور بے باکی سے من و عن پیش کر دیا ہے۔ڈاکٹر انوار احمد، روبینہ ترین، لطیف الزماں بالخصوص پروفیسر صابر کلوروی اور ظہور احمد اعوان کا ذکر نہایت تفصیل سے محبت اور عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ ظہور احمد اعوان کی شخصیت کے ان سربستہ رازوں سے پردہ ہٹایا ہے جہاں تک ایک عام طلب علم کی رسائی ناممکن تھی۔ڈاکٹر سلمان علی ظہور احمد اعوان کی شخصیت اور فن کے دلدادہ ہیں۔مشتاق احمد یوسفی نہایت محتاط انداز اپناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''ظہور احمد اعوان صاحب کا ذکر تو اتنی تفصیل، تواتر اور محبت آمیز شگفتہ و سرشار لہجے میں کرتے ہیں کہ کبھی کبھی اور کہیں کہیں تو گمان گزرتا ہے کہ کتاب کے نام "اے نشۂ ظہور" سے مراد کہیں نشۂ ظہور احمد اعوان تو نہیں!''(15)

بلاشبہ یوسفی محتاط انداز اپنانے کے لیے اپنا جواز رکھتے ہوں گے تاہم راقمان الحروف کا بالاتفاق یہ رائے ہے کہ ہر چند کتاب کے ٹائٹل پر کہکشاں کی تصویر کوئی اور کہانی سناتی ہوئی خواجہ میر درد کو کتاب کے نام کے لیے سزاوار ٹھہرائے لیکن ڈاکٹر سلمان علی جب اس سفر سے واپس آئے ہونگے اور تھکاوٹ سے چور ہونے کے باوجود ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی طرف سے کتاب کی تکمیل کے تقاضے کے پیشِ نظر آدھی رات کے وقت کتاب کے مسودہ کو بار بار الٹ پلٹ کر تھک چکے ہونگے تو اپنے مخصوص انداز میں ان کے زبان پر یہ مصرع وارد ہوا ہوگا کہ "اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے" اور مکمل یقین کے ساتھ تحریر کیا جاتا ہے کہ اس وقت "نشۂ ظہور احمد اعوان" ہی مراد تھا۔ بعد میں سرِ ورق پر کہکشاں کی تصویر چھاپنے کے پیچھے کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جو یہاں خارجِ بحث ہیں۔ ان اصحاب کے علاوہ ڈاکٹر سلمان علی نے اپنے میزبانوں سردار میاں مسعود اور سردار میاں محمود کی شخصیات کا جس انداز میں نقشہ کھینچا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہی باتیں جاری تھیں کہ دو اصحاب ملتے جلتے لگ بھگ ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں، دراز قد چھتری نما اونی ٹوپیاں سر پر رکھے سانولے رنگ مائل بہ سیاہی، کلف لگی کاٹن کی قمیص اور تہمد میں ملبوس، چہرے پر سفید بالوں کا نہایت ہی ہلکا سا سفید شیڈ جسے داڑھی بھی کہہ سکتے ہیں۔ پاؤں میں سلیپر، تپاک سے آئے، پیار سے ملے اور اطمینان سے نشستیں سنبھال لیں کھڑے کھڑے دوران مصافحہ ان اصحاب کے بارے میں پتہ چلا کہ دونوں بھائی ہیں یقیناً ہونا بھی چاہیے۔''(16)

خاکہ نگاری کے فن کی جزئیات سے واقفیت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر سلمان علی کی حس مزاح بھی کمال کی ہے۔ وہ ایسی جگہوں پر بھی مزاح دریافت کر لیتے ہیں جو بظاہر نارمل معلوم ہوتی ہیں اور کسی کا ذہن وہاں مضحکہ خیز پہلوؤں کی طرف نہیں جاتا۔ انہوں نے سیدھے سادے سپاٹ موضوعات، واقعات اور چیزوں کو بھی اپنی مخصوص نظر سے دیکھ کر اس انداز میں ان کی پیش کش کی ہے کہ خود بہ خود مزاح پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے بقول ''لطیفہ بھی ایک چھوٹا خاکہ ہوتا ہے۔''17 ایک فطری مزاح نگار جب قلم اٹھاتا ہے تو اسے، مزاح تک پہنچنے کے لیے کسی تمہید کے پل سے گزرنا نہیں پڑتا ہے۔ ''اے نشہ ظہور'' جو ایک تعلیمی دورے کی روداد ہے۔ اس سفر میں ڈاکٹر سلمان علی کے ساتھ ان کے ہمسفروں میں قیوم حسین بخاری، پی ایچ ڈی اسکالر بھی شامل تھے۔ ان کی شخصیت و

کردار کو جس منفرد انداز میں انہوں نے ابھارا ہے وہ ان کی نفسیات میں دسترس رکھنے کا بین ثبوت ہے۔ قیوم حسین بخاری کا تعارف ان الفاظ میں کرواتے ہیں کہ

> ''بخاری صاحب کا تعلق آزاد کشمیر کے علاقے سہنہ سے ہے۔ وہاں ایک مقامی سکول میں پرائمری سطح پر درس وتدریس جیسے مقدس فرائض کی انجام دہی پر مامور، موصوف نے بڑی تگ ودو اور مشکل سے جامعہ پشاور میں پی ایچ ڈی ادبیات میں داخلہ لیا۔ داخلہ دینے والوں نے یقیناً ان کی ظاہری خدوخال سے مرعوب ہو کر داخلہ دیا ہو گا کیونکہ حضرت جب تک خاموش رہتے، تو بلا کے خطیب اور ادیب دکھائی دیتے۔ انہیں اپنی اس صلاحیت کا نہ صرف بخوبی علم تھا بلکہ اس سے پوری زندگی کام بھی لیا۔۔۔ علاوہ ازیں ان کے چہرے پر خاص خاص موقعوں پر ایسی بسیط اور تعمق بھری شکنیں اور سلوٹیں بھی پیدا ہوتیں جو مدمقابل کے ذہن میں ان کی ایک بہت بڑے مفکر اور فلسفی کی دھاک بٹھا دیتی۔۔۔۔ جہاں کہیں دوست احباب ان سے سوال کرتے یا تحقیقی اُمور میں ان کی رائے معلوم کرتے تو حضرت ابتدائی مرحلے میں ایسی معنی خیز انداز میں ہلکا سا تبسم ظاہر فرماتے اور دوسری قسط میں یکلخت ایسی گہری، عمیق اور زمانی اعتبار سے اتنا مناسب سکوت اختیار کر لیتے جس سے بغیر تکلم ان کی مطلوبہ صورت حال خود بخود تخلیق ہوتی چلی جاتی ۔۔۔ صاحبِ سوال احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا۔۔۔ مفکر دانش ور اور فلسفی تو وہ لگ ہی رہے ہیں اگر نام کے ساتھ فقط ڈاکٹر کا سابقہ بھی لگ جائے تو گویا ان کی دانشوری پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے۔۔۔۔ کچھ نہ بھی ملے تو مجاز مرسل کے لیے ایک جواز بہر حال پیدا ہو ہی جائے گا بھلے سے پوری زندگی مجاز مرسل کے سائے تلے ہی بسر کیوں نہ ہو۔''(18)

مندرجہ بالا اقتباس کے تناظر میں دیکھا جائے تو موصوف نے اس مختصر سی کتاب میں انسانی اعمال وافعال، حرکات وسکنات، محسوسات کا ایسا عمیق سمندر بند کر دیا ہے جس کی ہر آن اور ہر لمحہ، ہر سطر اور ہر جملہ ایک الگ سمت اور ایک الگ زاویہ لیے بیٹھا ہے۔ اور حیرت اس امر پر ہے کہ ہر موقع محل میں پیش کیے گئے بیانیوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس مدلل انداز سے متفق ہونے کے لیے کسی قسم کی شعوری کاوش کا قطعاً گزر نہیں ہے۔ قاری از خود اس ماحول کا حصہ بن کر ویسا ہی محسوس کرنے لگتا ہے جو موصوف محسوس کرانا چاہتے ہیں اور ان کے ٹرانس سے نکلنے کے بعد قاردی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ موضوع چاہے دنیا اور عقبی کی کوئی چیز ہو۔ ''اے نشہ ظہور'' کو پڑھیں تو آورد نہیں آمد محسوس ہوتی ہے۔ ''اے نشہ ظہور'' کا اسلوب بے ساختگی، برجستگی، بذلہ سنجی اور اختصار کا بہترین مرکب ہے۔ کہیں کہیں مکالماتی انداز اختیار کیا گیا ہے تو کہیں کہیں خود کلامیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب مختلف اسلوبیات کی آماجگاہ اور خزینہ بنی ہوئی ہے۔

''اے نشہ ظہور''ایک مختصر کتاب ہونے کے باوجود سدا بہار کتاب ہے۔سیاسی خیالات اور سیاست کے بارے میں جہاں تک رائے کا تعلق ہے تو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس میں بعض اشارے بڑے دلچسپ انداز میں ملتے ہیں۔دوران سفر ڈاکٹر سلمان علی نے کوہاٹ ٹنل کا ذکر کرتے ہوئے جس تلمیحی انداز میں ایک بڑی حقیقت کا پردہ چاک کیا ہے۔اس کی جیسی عمدہ مثال اور کسی فن پارے میں دکھائی نہیں دیتی،اس میں بہ یک وقت علامت بھی ہے اور بے باکی بھی ہے،طنز بھی ہے اور مزاح بھی،سیاستدانوں سے بے زاری کا اظہار بھی ہے اور ان کے رویوں کو سامنے لانے کا ایک ہلکا پھلکا انداز بھی ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ بے عملی اور خود نمائی صرف سیاست و سیادت ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں یکساں طور پر نظر آتی ہے۔ایسے موقعوں کی پیش کش اور ان پر نکتہ چینی کے لیے پر ڈاکٹر سلمان علی جیسی بالغ نظری کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے جو ان تلخ حقیقتوں کو بھانپ کر ان کو ان کے جزئیات کے ساتھ طشت از بام کرتے ہوئے مخلوقِ خدا کو ان گندم نما جو فروشوں کے دھوکے میں آنے سے بچنے کی تلقین لی ہوئی ہو۔نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> ''ٹنل کا افتتاح اور آمد و رفت کے لیے کھولے جانے کی جلدی ہونے لگی اور اسی جلدی میں فرہاد کی کوتاہ نصیبی پر کڑھ بھی رہا تھا۔۔۔بس نوک پلک سنوارے جانے کے بعد خسرو پرویز کو یا تو اسے بہ یک جنبشِ قلم رد کرنا تھا یا شرفِ قبولیت بخش کر تاریخ میں اپنا نام سنہرے حروف سے رقم کرنا تھا،ہر دو صورتوں میں فرہاد نے اب بھی تہی دست ہی جانا تھا۔دکھ یہ نہیں کہ فرہاد کے جانے کی کسی کو فکر نہیں، المیہ یہ ہے کہ ہم خسرو پرویز کو آج بھی فرہاد سمجھ رہے ہیں،اب ہم کام کے بجائے نام کی تختی دیکھتے ہیں۔''(19)

اسلوبیاتی تنقیدات کی روشنی میں اسلوب وہ ہے جو ہمارے طرز احساس، تخیل، زبان و بیان کے انداز، الفاظ کے چناؤ اور جملوں کی ساخت کے ساتھ ساتھ معانی کی تہہ داریوں کی ملی بھگت سے وجود پاتا ہے اور ایک نتھرے تخیل، عمیق مشاہدے، چھوٹے چھوٹے برجستہ جملوں اور منفرد طرزِ تحریر سے مملو ایک سلجھا ہوا اسلوب ''اے نشہ ظہور''پر پر فشاں ہے، جس میں سے کبھی مزاح کی خنک بوندیں ٹپکتی ہیں تو کبھی طنز کے تیر و نشتر برسنے لگتے ہیں۔ مزاروں، درباروں اور بالخصوص مریدوں پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اٹھاون قبریں مختلف چھوٹی بڑی قطاروں میں نظر آئیں زائرین کی کثرت تھی جو بیچ میں ایک بہت بڑی قبر کے غلاف کو اپنے وجود سے ملتے اور قبر میں لگے پتھروں کو چوم رہے تھے، عورتیں یہاں اس عمل میں مردوں سے بھی آگے نظر آئیں جس سے ان کے معاشرے میں پیچھے ہونے کا راز کھلا۔''(20) روحانی و وجدانی رابطے غیر مرئی کشف و الہام کی دین ہوتے ہیں۔ مگر یہاں تو صورت حال ہی الگ ہے۔ جیسے جیسے سفری منازل طے ہو رہی تھیں اسی رفتار سے مصنف پر روحانیت کے نئے

باب وا ہو رہے تھے۔ جس کی مستند دلیل سکون قلب کا میسر آنا ہے۔ تعلیمی سفر روحانی، ازلی و ابدی سفر کی سمت کا تعین کر رہا تھا۔ ان جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''اب یہ سفر ہمارے وجود کا حصہ بن گیا تھا ہم صرف جسمانی سطح پر اس سفر میں نہیں رہے بلکہ روحانی طور پر بھی آگے بڑھتے گئے میں نے زندگی میں پہلی بار اپنے جسم اور روح کا اطمینان بخش ملاپ محسوس کیا۔۔۔''(21)

یہاں پر قلب ماہیت کی ایک مکمل کیفیت اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے، اگرچہ یہ کیفیات کتاب میں مزید متعدد جگہوں پر محسوس کی جاسکتی ہیں۔ اپنے وجدان کے اندر جھانکتے ہوئے خود کلامی و خود سرزنشی کی کیفیات بھی جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ روشنی سے اندھیرے تک کا سفر اور پھر کائنات پر پرفشاں ہونے والے اندھیروں کے اوٹ میں اپنی روح و وجدان کی روشنی کی طرف پلٹ جانے کے تجربے سے گزرنے کے بعد اقبال کے شعر:

؎ ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی(22)

کے مصداق اپنے باطن کے اندر جھانکنے اور اس سے گہرا تعلق استوار کرنے کے حوالے سے کہتے ہیں کہ

''سیاہیٔ لیل میں نظر کا رابطہ مظاہر سے کٹ جانے کے بعد انسان خود سے ہم کلام ہوتا ہے اور اس طرح باطن کے اسرار کھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔''(23)

ہلکے پھلکے انداز نظر اور شگفتگی طبع کی بنا پر مختار مسعود اور یوسفی کے ملے جلے اسلوب سے ڈاکٹر سلمان علی کا اسلوب وجود میں آیا ہے۔ مختار مسعود کے '' قحط الرجال'' میں سیزر نے سکندر کا حال پڑھا تو آہ و زاری کرنے لگا کہ میری عمر تک سکندر کتنے ہی ملک فتح کر چکا تھا۔ اسی طرح ''اے نشہ ظہور'' میں ڈاکٹر سلمان علی ظہور احمد اعوان کی تخلیقات کے بیان میں عالم خواب کی روداد کا ذکر بہت شگفتہ اور خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔ مختار مسعود نے الفاظ کے چناؤ، زبان و بیان کی سطح (مختصر مگر جامع) پر جو تجربات کیے وہ ان کی خاص پہچان بن گئے۔ یہی اسلوبیاتی عکس ڈاکٹر سلمان علی کی تحریر میں واضح نظر آتا ہے۔ شمیم حنفی کے بقول ''سچا تخلیقی اسلوب صرف لفظوں اور اصوات کا مجموعہ نہیں ہوتا ہے ہر بڑے اور منفرد اسلوب کے پیچھے تجربے اور تصور کی دنیا آباد ہوتی ہے۔''(24) یہی تجربے اور تصور و تخیل کی دنیا "اے نشۂ ظہور" میں ہر طرف اپنی جلوہ سامانیاں بکھیرتی نظر آتی ہے، تخیل کی اس دنیا پر بادلوں کی طرح سایہ فگن اسلوبِ نگارش کی رنگینی اور دل نشین انداز اس مختصر کتاب کو ادبی فن پاروں کی صف میں لا کھڑا کرنے کے لیے کافی ہے۔

حوالہ جات

1۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقا، وقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۴، ص ۴۱۳

2۔ ایضاً، ص ۱۵

3۔ القران، سورۃ الرحمان، آیت ۱تا۴

4۔ سلمان علی، ڈاکٹر، اے نشہ ظہور، پن مین پبلیشرز، پشاور، ۲۰۰۹، ص ۸

5۔ ایضاً، ص ۱۰

6۔ ایضاً، ص ۱۴

7۔ ایضاً، ص ۴۹

8۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰، ص ۲۵۹

9۔ عابد علی عابد، سید، اسلوب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰، ص ۴۲

10۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور جدید اردو تنقید، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۹، ص ۲۰۰

11۔ سلمان علی، ڈاکٹر، اے نشہ ظہور، پن مین پبلیشرز، پشاور، ۲۰۰۹ء، فلیپ

12۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور جدید اردو تنقید، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۹، ص ۲۰۹

13۔ سلمان علی، ڈاکٹر، اے نشہ ظہور، پن مین پبلیشرز، پشاور، ۲۰۰۹، ص ۱۱

14۔ مشمولہ۔ماہنامہ صریر کراچی۔جون/جولائی ۲۰۰۲، ص ۴۴۶

15۔ یوسفی، مشتاق احمد، دلِ من مسافرِ من، مشمولہ: اے نشہ ظہور، ڈاکٹر سلمان علی، پن مین پبلیشرز، پشاور، ۲۰۰۹ء

16۔ سلمان علی، ڈاکٹر، اے نشہ ظہور، پن مین پبلیشرز، پشاور، ۲۰۰۹، ص ۵۹

17۔ ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر، حساب دوستاں (در کتاب)، ادارہ علم و فن پاکستان، پشاور، ص ۹

18۔ سلمان علی، ڈاکٹر، اے نشہ ظہور، پن مین پبلیشرز، پشاور، ۲۰۰۹، ص ۸۷۔۸۸

19۔ ایضاً، ص ۱۱۔۱۲

20۔ ایضاً، ص ۴۹

21۔ ایضاً، ص ۹۶

22۔ اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال اردو، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۸

23۔ سلمان علی، ڈاکٹر، اے نشہ ظہور، پن مین پبلیشرز، پشاور، ۲۰۰۹، ص ۲۱

24۔ طارق سعید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی، ص۹